Research Journal Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر06، شمارہ نمبر01، جون-2025

پاکستان میں اردو مرثیے کی روایت

The Tradition of Urdu Marsia in Pakistan

Dr. Shahab Safdar,
Assistant Professor, Urdu Department, Alhamd Islamic University, Islamabad

Dr. Muzaffar Hussain,
Associate Professor, Urdu Department, Alhamd Islamic University, Islamabad

Dr. Jabir Hussain,
Assistant Professor, Urdu Department, Alhamd Islamic University, Islamabad

eISSN: 2789-6331
pISSN: 2789-4169

Copyright: © 2025 by the authors. This is an open access article distributed under the terms and conditions of the Creative Common Attribution (CC BY) license

Abstract

Marsia is one of the most important genre of Urdu poetry. The classical era of Marsia emerged in Lucknow. Mir Babar Ali Aness and Mirza Salaamat Ali Dabeer are the classical poets of Urdu Marsia.

The tradition of Urdu Marsia prevails in Pakistan and one can see an evolution in this golden tradition. Some of the important poets have migrated from India to Pakistan. These poets played a vital role in the development of the tradition of Urdu Marsia in Pakistan. Some prominent names are Josh Maleeh Abadi, Naseem Amrohvi, Saba Akbar Abadi, Mustafa Zaidi, Iftikhar Arif and Hilal Naqvi.

In this research article, the tradition and evolution of Urdu Marsia has been discussed and analyzed.

Keywords: Marsia, Tradition, Urdu, Literature

Research Journal Tahqeed تحقیقی مجلہ تحقید

جلد نمبر 06، شمارہ نمبر 01، جون-2025

دیگر اصناف سخن کی طرح پاکستان میں اردو مرثیہ بھی پچھتر سال کا تخلیقی سفر طے کر چکا ہے۔ ان پچھتر سالوں میں اردو مرثیہ کے بنیاد گزار تو وہی شعرا تھے جو دہلی، لکھنؤ اور امروہہ جیسے ادبی مراکز سے ہجرت کر کے کراچی، لاہور یا دوسرے شہروں میں مقیم ہوئے۔ ان میں قدیم و جدید دونوں طرز کے حامل مرثیہ گو موجود تھے۔

کلاسیکی مرثیہ اپنے اجزائے ترکیبی کے التزام کے ساتھ انیس و دبیر کے عہد میں کمال کی منزل تک پہنچ چکا تھا۔ تاہم ان کے بعد ان کے ورثا اور شاگردوں نے اس روایت کو آگے بڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اگرچہ وہ ان بزرگوں کے ہم پلہ تو نہ ہو سکے لیکن اس صنف کے فروغ میں ان کی مساعی کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کلاسیکی مرثیہ چہرہ، سراپا، اجازت، رخصت، جنگ، شہادت، بین وغیرہ کا پابند ہونے کے ساتھ ساتھ مسدس کی ہیئت کو بھی اپنے لیے مخصوص کر چکا تھا۔ کلاسیکی مرثیہ واقعات کے دلآویز بیان درد و سوز صنائع بدائع اور شعر کی جملہ خوبیوں سے آراستہ پیراستہ تھا۔ ان سب خوبیوں کا مرکز و محور سامعین و حاضرین کی واہ واہ اور آہ آہ تھی یعنی اپنے آغاز میں شاعر کی توجہ جتنی اپنے سننے والوں کو مہارت فن سے متاثر کرنے پر ہوتی شہادت اور بین کے حصوں میں اتنی بلکہ اس سے زیادہ گریہ دلکا پر ہوتی۔ شاعر زیادہ سے زیادہ اور بلند سے بلند داد و فریاد کو اپنی محنت کا صلہ جانتا۔ چونکہ کلاسیکی مرثیہ چار سو سال سے زینہ بہ زینہ ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا اس لیے مرثیہ گو اور حاضرین مجلس اس ساری صورت حال کے نہ صرف عادی اور بلکہ اس پر مطمئن اور شکر گزار تھے کہ وہ نہایت ایمانداری اور جاں فشانی سے ایک مذہبی فریضے کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ ضمناً ادب کی خدمت بھی ہو رہی ہے تو یہ بات اور زیادہ باعثِ تسکین ہے۔

بیسویں صدی کے شروع ہونے تک یہی ماحول رہا لیکن انجمنِ پنجاب کے نظمیہ مشاعروں اور مسلمانوں کی ابتر صورت حال نے جہاں شاعروں کو کچھ اور سوچنے پر مجبور کیا وہاں مرثیے کے شاعر کو بھی احساس ہوا کہ ہم لذتِ گریہ میں فلسفہء شہادت کو کہیں فراموش کر رہے ہیں۔ لہٰذا مقصدِ کربلا کی طرف دیکھنے اور اس کو اجاگر کرنے کا احساس بڑھا اس موڑ پر جدید مرثیے نے جنم لیا۔

جدید مرثیے میں فلسفہء شہادت پر زور دیا گیا گویا جدید مرثیہ ایک رثائی نظم ہوتی ہے جس میں موضوع کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کوئی ایک عنوان مقرر کر کے شاعر درجہ بہ درجہ اپنے مقصد تک پہنچتا ہے۔ جدید مرثیہ انسان، زندگی اور کائنات کی پیچیدہ گرہوں کو کھولتا ہے۔ جدید علوم سے استفادہ کیے بغیر یک لفظی یا کسی مرکب عنوان کے جملہ پہلوؤں کا احاطہ کرنا ممکن نہیں رہتا، لہٰذا دیگر علوم پر شاعر کی نگاہ از بس ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ کلاسیکی مرثیہ گو صرف شاعر تھا وہ بھی بہ یک وقت مؤرخ، جنگ جو، محدث اور عربی و فارسی کا عالم ہونے کے لیے نفسیات، سماجیات اور مذہبیات کا گہرا شعور رکھتا تھا اسی بنیاد پر تو انیس و دبیر آج بھی عظیم شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ لیکن وقت

کے ساتھ ساتھ ان علوم نے جو ترقی کی اور انسانی سوچ نے جو زاویہ اختیار کی اس کو پیش کرنے کے لیے جدید مرثیہ نگاروں کو بڑی محنت کرنا پڑی۔ اگر اردو مرثیے میں موضوعاتی تنوع نہ آتا تو یہ صنف شائد صرف مذہبی حوالہ تو رکھتی اپنی ادبی حیثیت کھو بیٹھتی، اس لیے جدت پسند تخلیقی ذہن کے حامل شعرا نے اس میں تبدیلی کو ناگزیر گردانتے ہوئے جدید مرثیے کی ابتدا کی۔ مرثیہ فنی طور پر ایک ایسی صنف ہے جس میں تمام اصنافِ سخن کی خصوصیات جمع ہو جاتی ہیں۔ اس میں تغزل، تمثیل کاری، جذبات نگاری، مکالمہ، زبان کی صفائی، شوکت الفاظ وغیرہ سب موجود ہے۔ اردو مرثیہ قلی قطب شاہ سے لے کر شاد عظیم آبادی تک ان صفات سے متصف رہا ہے۔ بیسویں صدی جہاں اور انقلاب آفریں تغیرات کا سبب بنی وہاں اردو مرثیے کے داخل میں اور کچھ عرصہ بعد خارج میں بھی تبدیلی رونما ہوئی۔ بہر حال تقسیم کے وقت قدیم و جدید اسالیب کی حامل معتد د تعداد اس صنف کی آبیاری میں مصروف تھی۔ ان میں مشترکہ بات منطقی استدلال اور رفعتِ تخیل تھی۔ ذیل میں قیام پاکستان کے بعد اردو مرثیے کے نمایاں ناموں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

جوش ملیح آبادی کی شہرت نظم نگاری کے حوالے سے ہے انہیں جدید مرثیے کا بانی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" 1930 میں لکھا۔ اس کے بعد "حسین اور انقلاب" 1941 میں کہا۔ اس مرثیے کے بارے میں سید محمد عقیل لکھتے ہیں:

"جوش کے "حسین اور انقلاب" کے ساتھ مرثیہ کے سماجی تار پور میں اس وقت کے ہندوستان میں ہونے والے انقلاب کی دھمک سنائی دیتی ہے"۔

جوش چودہ سو سال پہلے کی کربلا کو عصرِ موجود کی کربلا سے جوڑتے ہیں تو اردو مرثیہ ایک نئی جہت سے آشنا ہوتا ہے۔

مجروح پھر ہے عدل و مساوات کا شعار
اس بیسویں صدی میں ہے پھر طرفہ انتشار
پھر نائبِ یزید ہیں دنیا کے شہر یار
پھر کربلائے نو سے ہے نوعِ بشر دوچار
دے زندگی جلالِ شہِ مشرقیں دے
اس تازہ کربلا کو بھی عزم حسین دے

"جوش کے انقلابی مرثیے" ڈاکٹر ہلال نقوی کی مرتب کردہ کتاب ہے اس میں موجد و مفکر، پانی، آگ، ذاکر سے خطاب جیسی رثائی شاعری کی اعلیٰ تخلیقات شامل ہیں۔

زبان و بیان پر قدرت اور حسینؑ کے طاغوت سے ٹکرا جانے کے عمل سے انتہائی عقیدت رکھنے کے سبب جوش کے مرثیوں میں ادب و فکر اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔ ان کی مرثیہ نگاری یزیدی قوتوں کے سامنے سینہ سپر ہونے اور پوری ایمانی و اخلاقی جرأت کے اظہار سے عبارت ہے۔ جوش مظلومیت بے خوف ترجمان ہے۔

سید آل رضا جدید مرثیے کا بڑا نام ہے۔ کراچی کو اردو مرثیے کا مرکز بنانے والے شعرا میں آپ کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ان کے پہلے مرثیے کا سن تصنیف قیام پاکستان سے قبل یعنی 1939 ہے لیکن ہجرت کے بعد اردو مرثیے کی طرف انہوں نے خصوصی توجہ مبذول کی۔ انہوں نے مرثیے میں عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اخلاقی مضامین کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ہمت، جرأت صبر و استقلال کا ذکر اگرچہ واقعات کربلا کے تناظر میں کرتے ہیں لیکن انسان کو ان اوصاف کو اپنا کر جبر و ظلم سے ٹکرانے اور حق کے لیے ہر ستم سہہ جانے کا درس دیتے نظر آتے ہیں۔ زبان و بیان پر ان کو مکمل دسترس حاصل ہے تاثیر کلام ان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کردہ ہے یوں ان کے مرثیوں میں جاذبیت بڑھ گئی ہے۔ ایک مرثیے میں مولا قلی کی قوت بیاں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں۔

مقصودِ بیاں حسب محل شرحِ شریعت
موضوعِ بیاں معرفت و صدق و اخوت
اندازِ بیاں ندتِ اظہارِ حقیقت
تزئینِ بیاں صرفِ کمال ادبیت
الجھے ہوئے ذہنوں کی گرہ کھول رہے ہیں
الفاظ ہیں نازاں کہ علی بول رہے ہیں

چونکہ سید آل رضا اسی چشمہء فیض سے متمتک ہیں اس لیے ان کے کلام میں بھی مقصود و انداز و موضوع و تزئین حسنِ اکتساب کی جھلک دکھاتی ہے۔

نسیم امروہوی بطور ماہر لسانیات، لغت نویس، شاعر، محقق ناقد، مترجم اور صحافی شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے پندرہ برس کی عمر میں پہلا مرثیہ کہا جو 96 بندوں پر مشتمل تھا۔ پہلے ہی مرثیے میں تازگیء خیال جادو جگاتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ مرثیہ اس وقت کہا گیا جب لوگ کلاسیکی مرثیے کی فضا میں جکڑے ہوئے تھے اور ابھی ترقی پسند تحریک کا غلغلہ بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ نسیم امروہوی نے مرثیے کو زندگی کے مسائل سے ہم آہنگ کر دیا۔ ان کے مرثیوں میں عالمانہ وقار، منطقیانہ استدلال اور قرآن و احادیث کے مفاہیم و مطالب کا بیان ملتا ہے۔ شہدائے کربلا اور محمد و آل محمد کی سیرت مصرعوں کو تابندگی عطا کرتی ہے۔ ان کے ہاں "آدمی و انسان" کا تصور اگر غالب کی یاد دلاتا ہے تو

"عقل و عشق" کا تقابل اقبال کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ لیکن ان کے مصرعے اپنے ہیں مذکورہ شعرا کی بازگشت ہرگز نہیں بلکہ فکر و فلسفہ ان کے اپنے تخلیقی رنگ میں ڈھلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ واقعات و مقاصد کربلا کی طرح "حمد و نعت" و منقبت کے مضامین بھی انہوں نے نہایت خوبصورتی اور تخلیقی رچاؤ سے باندھے ہیں۔ ایک نعتیہ بند دیکھیں:

انسانیت کو ذوقِ ہنر سے ملا دیا
ذوقِ ہنر کو فکر و نظر سے ملا دیا
فکر و نظر کو صدقِ ہنر سے ملا دیا
قلب و جگر کا جوڑ کے رشتہ دماغ سے
محفل سجی چراغ جلا کر چراغ سے

صبا اکبر آبادی غزل، نعت، مرثیہ، سلام، رباعی کے حوالے سے ایک مستند نام ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری کا سفر 1930 سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے مرثیے رونے رلانے سے زیادہ آلام و مصائب برداشت کرنے ہمت و استقلال دکھانے اور باطل قوتوں سے ٹکرا جانے کا درس دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کربلا حرکت و عمل کا استعارہ ہے اس لیے زندگی کو اس حرکت و عمل سے جوڑنے کے لیے ہمیں کربلا سے روشنی لینی ہوگی۔ صبا اکبر آبادی کے مرثیوں میں ان کا تبحر علمی تخلیقی سانچے میں ڈھلا ہوا مصرع مصرع ارتقاء کے زینے طے کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ ایک قادر الکلام اور ہمہ جہت شاعر ہیں اس لیے ان کے ہاں نظم کی کڑی کہیں گم نہیں ہوتی۔ انسانیت کی اقدار کا علم انہوں نے بلند کیا ہوا ہے اور شہدائے کربلا اس رستے پر اپنے لہو سے جو چراغ جلا گئے ہیں صبا اکبر آبادی ان کی لو میں سفر کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سفر خالی خولی عقیدت کا نہیں بلکہ ایک سوچتے ہوئے ذہن اور بیدار بخت دل کا نصب العین تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ لہٰذا ان کے مرثیوں میں علمی و فکری موضوعات کا تنوع اور پر مغز مباحث ملتے ہیں۔ تخلیقِ کائنات کے حوالے سے ان کا ایک بند ملاحظہ فرمائیے:

خاک کے طبقے سے افلاک کے پردے تنے
بحر ابل کر آ گئے پیدا ہوئے جنگل گھنے
آسماں پر کہکشاں قائم ہوئی تارے بنے
پائی مٹی نے طہارت خاک کے ذرے چھنے
ساغرِ ہستی میں روحِ بے نشاں ڈھلنے لگی
زندگی لینے لگی سانسیں ہوا چلنے لگی

راجہ صاحب کا نام اگرچہ تحریک پاکستان کے ایک مجاہد اور محسن کے طور پر معروف ہے تاہم ان کو شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی۔ان کے دادا میر حسن بھی غزل اور مرثیے کے شاعر تھے۔ علامہ ضمیر اختر مرحوم کے مطابق راجہ صاحب آف محمود آباد نے آٹھ مرثیے کہے۔ پانی کے موضوع پر ان کے مرثیے کو جوش اور نسیم کے مراثی پر زمانی تقدم حاصل ہے۔ ایک مرثیہ جو انہوں نے حضرت ابوذر غفاریؓ کے غلام اور کربلا کے شہید حضرت جون کے حال میں لکھا ہے اس میں انہوں نے سرمایہ داری کی مذمت اور اسلامی مساوات کے اصولوں کو بڑی عمدگی سے پیش کیا ہے۔ان کے مرثیے شائع تو نہیں ہوئے تاہم ان کے فرزند راجہ محمد امیر خان کے پاس محفوظ ہیں۔

جون ہے نام غلام شہِ خیبر ہوں میں
اس بڑھاپے میں جوانوں کے برابر ہوں میں
تین دن کی ہے عطش طالب کوثر ہوں میں
خواہش زر نہیں گو عبد ابوذر ہوں میں
فخر عبدیت شاہِ دوجہاں رکھتا ہوں
اس ضعیفی میں بھی امید جواں رکھتا ہوں

شاہد نقوی نہ صرف مرثیہ گوئی میں مقام رکھتے ہیں بلکہ اردو مرثیے کے فروغ میں بھی ان کی کاوشیں لائق تحسین ہیں۔ 1941ء سے مرثیہ لکھنے کا آغاز کیا۔ نفس مطمئن ، والعصر، کرب جاوداں، صراط و سلسبیل، حصار حرم، رومال زہرا اور ضمیر مصلوب، ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ آغاز شاعری میں وہ ترقی پسند تحریک سے بہت متاثر تھے اس لیے استدلال اور برہان ان کی فطرت کا حصہ ہیں۔ فرحان رضا کے بقول ان کے محبوب موضوعات صلح امام حسن اور معراج تھے۔ قیصر نجفی لکھتے ہیں۔

"انہوں نے موضوعاتی اور کرداری دو اقسام کے مرثیے کہے ہیں جن میں علمی و فکری مباحث کے ساتھ ساتھ مسکی عنصر بھی اپنے شدید تاثر کے ساتھ موجود ہے"۔

ان کے مرثیوں میں شعریت غالب نظر آتی ہے۔ان کا ایک مرثیہ "ماں کا دل" اپنے موضوع کی انفرادیت کے باعث بہت مقبول ہوا اس مرثیے میں انہوں نے تاریخ انسانیت کی ان عظیم ماؤں کا تذکرہ کیا ہے جن کا ذکر قرآن و احادیث سے ہوتا ہوا کربلا تک آتا ہے۔

بعدِ بتول زینب مضطر تھی سیدہ
قاسم حسن تھے، بعثہِ شبیر تھی سیدہ
اکبر کے حق میں لیلیٰءِ بے پر تھی سیدہ

اپنی جگہ پہ مادرِ اصغر تھی سیدہ
سب سیدہ تھیں سب کا یہی اک اصول تھا
بہرِ حسین داغِ پسر بھی قبول تھا

ڈاکٹر یاور عباس نے 1935 میں پہلا مرثیہ لکھا۔ تقسیم کے بعد کراچی آئے تو مرثیے کے فروغ میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر ہلال نقوی نے تحقیق و تدوین کے بعد 2012 میں "ڈاکٹر یاور عباس کے مرثیے" کے عنوان سے کتاب شائع کی۔ جدید مرثیے کی جملہ خوبیاں ڈاکٹر یاور عباس کے مرثیوں میں موجود ہیں۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر ہلال نقوی لکھتے ہیں:

"آج کے مرثیے میں زندگی کا وہ تمام شعور نظر آتا ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں"۔ تاریخ کربلا کے آئینے میں جب ہم اپنے کردار کا جائزہ لیتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم حق گوئی، ثابت قدمی اور صبر و براشت، سے کتنے تہی ہیں۔ ڈاکٹر یاور عباس کے مرثیے بھی انسان کو عزم و عمل کا درس دیتے ہیں ان کے ہاں غم ایک بڑی قوت کے طور پر ظاہر ہوتا ہے۔

لطف ہی کیا تھا اگر پھول نہ پاتا خوشبو
غم سے خالی ہی جو رہتا کہیں دل کا پہلو
آب کھو بیٹھتی جو آنکھ نہ پاتی آنسو
اتنی شائستہ نہ ہوتی کبھی انسان کی خو
غم نے انسان کو انسان بنا رکھا ہے
ورنہ اس خاک کی تعمیر میں کیا رکھا ہے

غم انسان کی زندگی کا مترادف ہے اگر اس غم کو کربلا سے نسبت ہو جائے تو یہ انسان کی تہذیب و تطہیر کرتا ہے۔ ڈاکٹر یاور عباس نے اپنے مرثیوں کے ذریعہ یہ فریضہ انجادینے کی سعی کی ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین مرثیے کی تخلق و تنقید کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں ذیشان زیدی لکھتے ہیں:

"وہ اردو مرثیے کے میدان میں ایجاد معانی وایزاد مطالب کی ایک مستقل علامت بن کر ابھرے۔ انہوں نے اردو مرثیے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ڈاکٹر صفدر حسین نے اپنے انفرادی انداز فکر اور رزمیہ آہنگ کی آمیزش سے کربلا کی حزینہ روئیداد کے بعض سانحات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اس کو مرثیہ نگاری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہو گئی"۔

ان کی تصانیف کی تعداد بارہ ہے۔ ”لبِ فرات“ کے نام سے پانچ جدید مرثیے شائع ہوئے۔ ان میں ایک مرثیہ ”جلوۂ تہذیب“ ہے۔

انہیں آیات منور نے اجالی دنیا
اسی پرتو کا نتیجہ ہے جمالی دنیا
چاہتی ہے یہ بہر حال مثالی دنیا
ہر مصفا عملی اور خیالی دنیا
یعنی آراستہ باطن بھی ہو ظاہر کی طرح
سینے روشن ہوں حبیب ابن مظاہر کی طرح

10 جنوری 1980 کے دن دربار حسین شیخوپورہ کی مجلس میں مرثیہ پڑھتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا۔ وردِ زبان مصرع تھا: دو تھے حجر کے علی و قرآں۔

خلش پیر اصحابی کا تعلق ضلع بھکر سے تھا۔ بذریعہ خط کتابت علامہ نجم آفندی سے اصلاح لیتے رہے۔ ان کی تصانیف میں تہذیبِ ماتم، شہر غم، ابرِ غم، چراغِ فکر، حسین اور اسلام، گلزارِ وفا، دھوپ اور کربلا شامل ہیں۔

انہوں نے مرثیے میں تجربات بھی کیے ہیں اور کلاسیکی مرثیے کی پابندیوں کو بھی ملحوظ رکھا ہے۔ ان کے مرثیوں میں منظر نگاری، کردار نگاری، صنائع بدائع کے عمدہ نمونے پائے جاتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات کی ندرت ان کے کلام میں نمایاں صفت کے طور پر ابھرتی ہے۔ ان کے مرثیے ”دھوپ اور کربلا“ سے ایک بند پیش خدمت ہے:

وہ پیاس کا نکلتا ہوا بن وہ تیز لو
انسانیت کی پیاس کو انسان کی جستجو
دشت وفا میں عالم ہستی کی آبرو
پیاسوں کے لب پہ شکر کی جاری وہ آبجو
ہلچل فرات غم میں تلاطم فرات میں
پرچم خدا کا سبط پیمبر کے ہاتھ میں

وحید الحسن ہاشمی جدید مختصر مرثیے کے پیش رو ہیں۔ ان کے مرثیوں میں ان کے استاد سید آل رضا اور ان کے پسندیدہ شاعر جوش ملیح آبادی کا رنگ یکجا نظر آتا ہے۔ ان کے فرزند شبیہ الحسن نے ان پر ایک کتاب "مختصر مرثیے کی روایت اور وحید الحسن ہاشمی" مرتب کی ہے۔ اس میں ان کے چالیس مرثیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

اسلام کے لباس میں شاہی تھی جلوہ گر
دست خدا تھا دست حکومت میں بے اثر
دھندلا گئی تھی شام میں قرآن کی نظر
بیٹھا تھا کفر مسندِ آل رسول پر
مغلوب پا کے حوصلہء مشرقین کو
اب زندگی پکار رہی تھی حسین کو

صہبا اختر اردو شاعری کا معروف نام ہے۔ غزل نظم خصوصاً قومی و ملی شاعری کے حوالے سے ان کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی تاہم انہوں نے مرثیے بھی لکھے ہیں جو تا حال غیر مطبوعہ ہیں۔ الفاظ کی گھن گرج، موضوع کی ندرت اور اسلوب کی جدت کے باعث یہ مرثیے متوجہ کرتے ہیں۔ ان کا ایک مرثیہ لفظ، علم، زندگی کے عنوان سے ڈاکٹر ہلال نقوی نے اپنی مرتب کردہ کتاب "جدید بیاضِ مرثیہ" میں شامل کیا ہے۔ اس کا ایک بند ہے:

حرف کیا ہیں نغمگی ہیں چشمہء ہر سنگ کی
حرف کیا ہیں ایک صوتی شکل ہیں ہر رنگ کی
اک صدا بندی ہیں برق و باد کے آہنگ کی
گفتگو ہیں ہر نسان غیب سے فرہنگ کی
حرف ہی کنز خفی ہیں حرف ہی رمز جلی
ہے الف اللہ کا توبائے بسم اللہ علی

مصطفی زیدی کا اگرچہ ایک ہی مرثیہ ہے تاہم بقول ڈاکٹر ہلال نقوی بیسویں صدی میں جدید مرثیے کی بڑی ادبی تخلیقات میں مصطفی زیدی کے مرثیے کو جو اہمیت حاصل ہونا چاہیے تھی وہ حوادث و حالات کی بعض پیچیدگیوں کے سبب تنقیدی تحریروں میں اسے حاصل نہیں ہو سکی۔ اس مرثیے کے 150 سے زائد بند لکھے جا چکے تھے کہ ان کی حادثاتی موت نے اسے مکمل نہ ہونے دیا۔ "کربلا اے کربلا" کے عنوان

سے یہ مرثیہ مظلومیت کی تاریخ ہے۔ رثائی اور احتجاجی لے میں بھی ادبیت اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ اس کے کئی مصرعے اور بیتیں زبان زدعام ہیں۔ یہ مرثیہ ایک رحجان ساز شعری تجربہ ہے۔

ہر دور میں مظلومیت کی داستاں لکھی گئی
تادیب وجبر سلطنت کے درمیاں لکھی گئی
لمحوں کی زنجیروں میں سطر جاوداں لکھی گئی
تشریح بے عنواں زبان بے زباں لکھی گئی
جتنا شعار محتسب دشوار تر ہوتا گیا
اتنا ہی ذکر خونِ ناحق مشتہر ہوتا گیا

ساحر لکھنوی کے مرثیے ادبیت سے پُر ہیں۔ کراچی میں کلاسیکی مرثیے کی شمع تادم حیات روشن رکھنے والوں میں ان کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ وہ ایک اہل علم خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا مرثیہ گوئی کا شعور انہیں گویا گھٹی میں حاصل ہوا۔ انہوں نے ایک مرثیہ ایسا بھی لکھا ہے جس میں تقریباً سوا سو مرثیہ نگاروں کے ناموں کے علاوہ مرثیہ گوئی کے مختلف ادوار کا تذکرہ ہے۔ اس مرثیہ کا ایک بند یہ ہے جس میں دلگیر سے دبیر تک کا ذکر ہے:

دلگیر سے ہوئی اس امامت کی ابتدا
پہلے بھی مرثیہ تھا مگر یہ مستزاد تھا
پھر فیض ہے فصیح وخلیق وضمیر کا
وہ جن سے مرثیے کو ملا دبدبہ نیا
بخشا صلہ انہیں یہ جناب امیر نے
چمکا دیے ہیں نام انیس ودبیر نے

امیر امام حر جنہوں نے اردو ادب میں سب سے طویل مرثیہ کہا جس میں 1017 بند ہیں۔ راجہ صاحب آف محمود آباد کے بھانجے تھے۔ ان کے مرثیے کا ایک بند دیکھیے:

زمانہ یاد کرتے سر گزشت یوم الدیار
وہ گرد قصر خلافت، مخالفوں کا حصار

بگڑ گئے تھے خلیفہ سے اہل شہر و دیار
کسی طرح کی اعانت تھی اس گھڑی دشوار
محاصرے سے جو اس گھر میں قحط آب ہوا
علی سے اہل مروت کا اضطراب ہوا

قیصر بارہوی نے 1958ء میں مرثیہ لکھنا شروع کیا۔ لاہور کی مجالس میں مرثیہ خوانی سے ان کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے پوری توانائیاں صرف کر کے اس فن کو نکھارا۔ اس لیے اس پر فخر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فن کی دنیا ہے فقط مرثیہ گوئی کا شرف
لفظ ہیں گوہر نایاب نحیل ہے صدف
کعبہء دل میں بچھاتا ہوں جو ایمان کی صف
ماتمی آنکھ لٹا دیتی ہے کچھ دُر نجف
درد کے آئینے کاغذ پہ بکھر جاتے ہیں
حرف زنجیر کی مانند نظر آتے ہیں

امید فاضلی نوح ناروی کے شاگرد تھے۔ ان کے مرثیوں کے دو مجموعے شائع ہوئے "سرِ نینوا" اور "تب و تاب جاودانہ"۔ ان میں کل بارہ مرثیے ہیں۔ ان کی مرثیہ گوئی کے بارے میں عاشور کاظمی لکھتے ہیں:

"ان کے مرثیوں کے موضوعات عشق و شعور قرآن اور اہل بیت، علم و عمل، تہذیبِ نفس، صبر، سیدہ زینب، اس کی نشاندہی کر رہے ہیں کہ امید فاضلی کو طلوع کا سراغ مل گیا ہے اور انہوں نے غروب یا غروب ہونے والوں سے ناتا توڑ لیا ہے"۔

اس بیان کی تصدیق ان کے اس بند سے بھی ہوتی ہے:

روشنی وحی الٰہی روشنی قلب رسول
روشنی حرفِ یقیں حسن اثر باب قبول
روشنی ذہن خدیجہ میں تمنائے بتول
روشنی شبیر و شبر کی قیادت کے اصول
زد اصولوں پر گر آئے انقلاب آجائے گا

جلد نمبر06، شمارہ نمبر01، جون-2025

نوکِ نیزہ پر ابھر کر آفتاب آجائے گا

سردار نقوی اگرچہ کلاسیکی روایت کو پسند کرتے تھے لیکن ان کی سوچ اور فکر میں تازگی اور نیا پن نمایاں ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ کوئٹہ میں تعینات رہے۔ ان کی کوششوں سے وہاں اردو مرثیے کو رواج ملا۔ قرآنی تلمیحات کے حوالے سے ان کا ایک بند ملاحظہ ہو:

وہ شہرِ علم جس کی ثقافت ہے اُدِلُو
وہ شہرِ علم جس کی معیشت ہے انفقو
وہ شہرِ علم جس کی کرامت ہے اتقو
وہ شہرِ علم جس کی بشارت ہے تفلحو
یہ شہرِ کائنات الف لام میم ہے
یہ شہرِ استعارۂ ملکِ عظیم ہے

عبدالرؤف عروج کی کتاب "اردو مرثیے کے پانچ سو سال" 1961ء میں شائع ہوئی۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں انہوں نے مرثیے بھی لکھے۔ 1981ء میں انہوں نے مسدس کی جہت سے ہٹ کر ایک مرثیہ لکھا اسے ڈاکٹر ہلال نقوی نے ایک منفرد طرز کا مرثیہ قرار دیا ہے۔

مؤرخوں سے کہو تم نے کچھ نہیں لکھا
لکھی تو صرف سلاطین کی داستاں لکھی
ملوکیت کو قلم کا خراج پیش کیا
اصول دیں کے خلاف مزاج پیش کیا
پکارتے ہیں تمہارے حروف ہائے سیاہ
کشید کی ہیں دلوں کی سیاہیاں تم نے

رئیس احمر بھی عبدالرؤف عروج کی طرح مرثیے کو مسدس کا پابند نہیں رکھا بلکہ اسے آزاد نظم کی شکل میں لکھا اور اسے کربیہ کا نام دیا۔ انہوں نے اپنی کتاب "قلمِ فکر" کے آغاز میں اعتراف کیا ہے کہ انہیں آزاد نظم میں مرثیے کی تحریک پروفیسر کرار حسین کے مرثیے کو سن کر ہوئی۔

دہکتے موسم میں ارض بے آب و گیاہ پر
حسین گویا
یہ امر محسوس کر رہے ہیں۔۔
سے شروع ہونے والا مرثیہ تقریباً350 مصرعوں کے بعد یوں اختتام پذیر ہوتا ہے۔
کوئی زمانہ ہو
تشنہ کامی یہی کہے گی
حسین پانی
سبیل آب و بقا عطا ہو حسین
سوکھے لبوں پر ہر دم یہ التجا ہے یہی دعا ہے
حسین پانی، حسین پانی

سرگودھا میں مرثیے کی صنف کو فروغ دینے والوں میں ایک نام جوہر نظامی کا ہے۔ ان کی رثائی اور منقبتی شاعری کا مجموعہ ''حرج نور'' ان کے فرزند پروفیسر فرخ راجہ نے شائع کیا۔ انہوں نے بھی مسدس سے ہٹ کر مرثیہ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ایک بند دیکھیں:

کون ہے زخم پر زخم کھائے ہوئے
بے محابا لہو میں نہائے ہوئے
مرنے والوں کے صدمے اٹھائے ہوئے
یہ ہے محبوب رب، شہسوارِ عرب
سید خوش لقب، شاہ گلگو کی قبا
وارثِ انبیاء سرور اولیاء
صورت مصطفی، سیرت مصطفی
جس کے قبضے میں ہے ذوالفقار علی

اثر جلیلی، جلیل مانک پوری کے شاگرد تھے۔ کوئٹے کے قیام کے دوران میں انہوں نے ایک مرثیہ برف کے موضوع پر لکھا جس میں مقامی ماحول کی منظر کشی کی ہے۔ آخر میں اسے کربلا کی پیاس سے جوڑ دیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے یہ ایک منفرد تجربہ تھا۔ ان کے

مرثیوں کے مجموعے کا نام ''عکس کربلا'' ہے۔ پروفیسر مجتبیٰ حسین نے ان کی شخصیت اور شاعری کی تعریف کی ہے۔ ان کے مرثیے 'برف نامہ' سے ایک بند نذر قارئین ہے۔

مارے سردی کے ہے پہلو کا بدلنا دشوار
نفسِ گرم ہے برفانی ہوا سے دوچار
شعلہء جاں میں حرارت کے نہیں ہیں آثار
آگ کے پاس سے اٹھتے ہیں تو چڑھتا ہے بخار
گر نظر بھی کہیں دو چار قدم جاتی ہے
اس قدر برف کی شدت ہے کہ جم جاتی ہے

مسعود رضا خاکی نے حمد، نعت، سلام، منقبت، قصائد، قطعات، رباعیات کے ساتھ ساتھ مرثیے میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو منوایا ہے۔ تذکیہ کرب وبلا، لب کوثر، آیات وفا، کیف غم ان کی کتابیں ہیں۔ ''جدید مرثیے'' کے عنوان سے ان کی بیس مرثیے مرتب کیے گئے ہیں۔ ان کے بارے میں آغا سلمان باقر لکھتے ہیں:

''خاکی صاحب نے جدید مرثیے میں خاص طور پر ان موضوعات پر لکھا ہے جو آج کے جدید ترین سائنسی اور معاشرتی ارتقاء کا جزو ہیں''۔

صبر کا بند یہ ٹوٹا تھا مدینے جا کر

دور سے آئے تھے یثرب کے جو آثار نظر
دیکھتے ہی انہیں زینب جو گریں غش کھا کر
ام کلثوم نے خواہر کو سنبھالا بڑھ کر
غم کا سیلاب جو آنکھوں سے ابل کر نکلا
دردِ دل نوحہ کے الفاظ میں ڈھل کر نکلا

شاداں دہلوی کے مجموعہ ہائے مراثی میں نظم معلیٰ، معراج نگارش، دستور محرسہ، متاع منبر اور رزق سماعت شامل ہیں۔ سلام، منقبت، قصائد، رباعیات کے مجموعے ان کے علاوہ ہیں۔ اردو کے رثائی ادب میں ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ان کے مرثیوں میں رثائیت کا عنصر بھرپور ہے۔

سرِ حسین جو زندانِ شام میں آیا

توبڑھ کے بھائی کو ہمشیر نے سلام کیا
وفورِ نالہ وشیون سے ایسا حشر اٹھا
حرم بھی روئے تھے مولا کا سر بھی روتا تھا
علی یہ خواب کی تعبیر قید خانے میں
بپا تھی مجلسِ شبیر قید خانے میں

محشر خاموش، محراب حرم، منبع عدل جیسے مجموعوں کے خالق افسر عباس زیدی اردو مرثیہ نگاری میں ایک قابل ذکر نام ہیں۔ سہل ممتنع اور عام فہم کلام سے سامعین خوب محظوظ ہوتے۔ لاہور میں مجالس مرثیہ کی رونق بڑھانے والوں میں ان کا نام یاد رکھا جائے گا۔ مولا علی کی شان میں ایک مرثیے کی ابتدا اپنے مخصوص رنگ میں کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ازروئے عقل علم پیمبر تجھے ملا
بے مثل و بے نظیر مقدر تجھے ملا
خیبر کے روز پرچم لشکر تجھے ملا
ہجرت کی شب رسول کا بستر تجھے ملا
ایماں نے تجھ کو دولت صبر و قرار دی
دختر نبی نے حق نے تجھے ذوالفقار دی

سید ذوالفقار حسین رضوی المعروف سیف زلفی نے "تا بہ خاک کربلا" کے حوالے سے رثائی ادب میں اپنی پہچان بنائی۔ ان کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے وحید الحسن ہاشمی کی رائے تھی:

"سیف ذلفی کے ہاں مسئلہ صرف مرثیے کی اندرونی ساخت کا تھا جسے قیصر بارہوی کی صحبت اور نصیحت نے حل کر دیا"۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن نے "سیف زلفی کے مرثیے" کے عنوان سے ان کے کلام کو مرتب کیا ہے۔

لکھتا ہے داستان قیادت مرا قلم
کرتا ہے جنگ امن کی صورت مرا قلم
پی کر شعور و فہم و فراست مرا قلم
دیتا ہے زندگی کو حرارت مرا قلم

جلد نمبر06، شمارہ نمبر01، جون-2025

میرے قلم کی چھاؤں میں جلتا ہے آفتاب
لفظوں کے دائروں میں مچلتا ہے آفتاب

کراچی کے مرثیہ نگاروں میں ایک نام کرار نوری کا بھی ہے۔ اگرچہ انہوں نے غزلیں، نظمیں بھی لکھیں لیکن مرثیہ نگاری میں ان کا نام انفرادیت کا حامل ہے۔

دنیا نے دیکھا باگ کو پھیرا حسین نے
تاریکیوں میں بھیجا سویرا حسین نے
کافور کر دیا ہر اندھیرا حسین نے
ہر دشمن حیات کو گھیرا حسین نے
اک عزم مستقل تھا کہ بڑھتا چلا گیا
مفہوم مرگ و زیست بدلتا چلا گیا

علامہ طالب جوہری کا نام خطابت کے حوالے سے تو کافی شہرت کا حامل ہے لیکن ان کے تین مجموعے غزل، نظم میں بھی ان کی دسترس کے گواہ ہیں۔ انہوں نے پہلا مرثیہ 1968 میں کہا۔ وقتاً فوقتاً اور مرثیے بھی لکھے ہیں۔ ''جدید بیاض مرثیہ'' کا آغاز ڈاکٹر ہلال نقوی نے علامہ طالب جوہری کے مرثیے سے کیا ہے۔

اے فکر جوان صفحہ ء دانش پر تم ہو
اے فرق گمان علم کی دہلیز پہ تم ہو
اے خامہ ء جاں دشت معانی میں علم ہو
اے طبع رواں زیب دہِ نوک و قلم ہو
تحریر کے قبضے میں ہو خشکی بھی تری بھی
ہو معترف زور قلم دیدہ وری بھی

کراچی کے مرثیہ گوؤں میں نسیم امروہوی کے فرزند قسیم امروہوی نے بھی مرثیے کی مشعل کو اگلی نسل تک بہت جاں فشانی اور محنت سے پہنچایا ہے۔

ظلمت میں ہے گھرا ہوا انسان اک طرف

جلد نمبر06، شمارہ نمبر01، جون-2025

آپس میں پنجہ کش ہیں مسلمان اک طرف
رکھا ہوا ہے طاق پہ قرآن اک طرف
بکتا ہے کھوئے داموں پر ایمان اک طرف
ملت میں یہ عجیب سیاست کا دور ہے
بو جہل بھی کہے کہ جہالت کا دور ہے

عارف امام نے پہلا مرثیہ ''زمین'' 1988ء میں اور دوسرا مرثیہ ''خون'' 1989ء میں کہا۔ ذیشان زیدی کے بقول دونوں مرثیے موضوع کی انفرادیت اور اپنی تخلیقی قوت کی وجہ سے بہت طاقت رکھتے ہیں۔ ان کے مرثیے ''زمین'' سے ایک بند پیش ہے:

دیکھئے خورشید سے ٹپکا ہوا آنسوز میں
عرصہ ءاحساس پر چھایا ہوا جادوز میں
مصحف انوار و رنگ ورامش وخوشبوز میں
بادۂ تخلیق کے نشے سے بے قابوز میں
یہ نظام مہر سے مربوط سیاروں میں ہے
یعنی یہ بھی روشنی کے حلقہ برداروں میں ہے

ستر کی دہائی کے وسط میں پشاور سے جلیل حشمی کا مرثیہ ''دولہو کا بھنور'' کتابی صورت میں شائع ہوا لیکن اب اس کی کوئی کاپی دستیاب نہیں۔ یہ مرثیہ ہیئت اور موضوع دونوں لحاظ سے ایک تجربہ ہے۔ کتاب کے فلیپ پر اسرار زیدی لکھتے ہیں:

''دولہو کا بھنور، واقعات کربلا سے متعلق ایک جدید مرثیہ ہے۔ ایسا مرثیہ جس میں زبان وبیان کے ساتھ شاعری بھی موجود ہے۔ اور ایک ایسا مقصد بھی جو انسانیت کی بنیادی اور اہم اقدار کو جلا بخشتا ہے''۔

محبوب شاہِ یثرب وبطحا کا ذکر ہے
مشکل کشا علی کے دل آرا کا ذکر ہے
روح وروان فاطمہ زہرا کا ذکر ہے
یہ تشنہ لب کا کشتہ ءاعدا کا ذکر ہے
مت بولیے کہ عالم امکاں ہے دم بخود

جلد نمبر06، شمارہ نمبر01، جون-2025

یاران انجمن مرے مولا کا ذکر ہے

ڈاکٹر ہلال نقوی نے "مرثیے کی نایاب آوازیں" مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں ان شعرا کا رثائی کلام شامل کیا گیا ہے جن کی وجہ شہرت دوسری اصناف کے سبب ہے لیکن انہوں نے کسی نہ کسی موڑ پر مرثیے کو بھی ذریعہ ءاظہار بنایا ہے۔ اس کتاب میں پندرہ شعرا کا کلام درج ہے جن کے اسمائے گرامی ہیں فیض احمد فیض، کیفی اعظمی، رئیس امروہوی، مصطفی زیدی، پروفیسر کرار حسین، صادقین، شوکت تھانوی، ڈاکٹر وحید اختر، قمر جلالوی، سید محمد جعفری، تابش دہلوی، راغب مراد آبادی، عبدالرؤف عروج، رئیس احمر اور جوہر نظامی۔

اس کتاب کے ابتدائیے میں وہ رقم طراز ہیں:

"مرثیہ انسانی رشتوں کی شاعری ہے اور آج جب رشتے ٹوٹتے چلے جارہے ہیں تو ہمیں مرثیے کی قدر کرنا چاہیے کہ ایک مقدس، مکرم، ممتاز و محترم خاندان رسالت کے رشتوں کے لہجے میں یہ منفرد شاعری ہر دور کے انسان سے ہم کلام ہے لکھنے والا کسی بھی مسلک سے منسلک ہو لیکن اس کے مرثیے کا جو تہذیبی آہنگ ہے اس کا کوئی مسلک نہیں۔ اس کا مسلک شہادت پر ایقان اور سچائی کا عرفان ہے۔ فیض صاحب کمیونسٹ ہوتے ہوئے مرثیہ لکھ رہے ہیں، کیوں؟ صادقین رنگوں کی قوس و قزح میں غلطاں ہونے کے باوجود شہادت کی سرخ فام کہکشاں سے لفظ تراشنا چاہتے ہیں آخر کس لیے؟ شوکت تھانوی اور سید محمد جعفری مزاح نویسی کی شناخت رکھتے ہوئے اپنے مرثیے سے گریہ ناک فضا میں داخل ہونا چاہتے ہیں کس واسطے؟ اس واسطے اور اس لیے کہ مظلوم مظلومیت سے رشتہ ہی آج کا سب سے بڑا رشتہ ہے"۔

"جدید بیاض مرثیہ" بھی ڈاکٹر ہلال نقوی کی مرتب کردہ کتاب ہے جس میں 25 معاصر شعرا کا کلام شامل ہے۔ ان میں علامہ طالب جوہری، پیر نصیر گولڑہ شریف، صہبا اختر، پروفیسر سحر انصاری، ساقی امروہوی، پروفیسر حسنین مہدی سید، عابد حشری، پروفیسر طاہر حسین، جمیل نقوی، ہدایت حیدر، سرور جاوید، فراسب رضوی، معصوم رضا، جاوید حسن، نقاش کاظمی، ڈاکٹر جاوید منظر، شبیہ حیدر، شہاب صفدر، قیصر نجفی، ذہین جعفری، علی یاسر، اختر آصف، جعفر عسکری جعفر، فدا حسین کاظم شامل ہیں۔

اگر معاصر رثائی ادب کی بات کی جائے تو تخلیقی تحقیقی اور تنقیدی حوالے سے سر فہرست نام ڈاکٹر ہلال نقوی کا ہے۔

وہ اپنی ذات میں ایک دبستان ہیں۔ اس مختصر مضمون میں ان کی خدمات کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ اردو مرثیے کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ان کی مساعی جمیلہ کی ایک طویل فہرست ہے۔ اذان مقتل، لیس تاریخ، مقتل و مشعل، ہاتھ چراغ، آواز، چشم نم جیسی کتابیں گواہ ہیں کہ انہوں نے مودت و عقیدت، کو ادبیت و شعریت سے لبریز پیرائے میں کس طرح سامعین و قارئین تک پہنچایا ہے۔ میری نظر میں وہ جدید اردو مرثیے کے مجتہد ہیں۔ یہ اجتہاد خارجی سطح پر بھی ہے کہ انہوں نے مسدس کے تیسرے مصرعے کو علامہ جمیل مظہری کے تتبع میں آزاد کر دیا ہے اور موضوعاتی وارتقاعی حوالے سے بھی کہ مضامین و افکار اور احساسات و جذبات کی رنگارنگیاں ایک دل نشیں اسلوب میں

ڈھل کر زینتِ قرطاس ہوتی ہیں۔ انہوں نے 1970 میں پہلا مرثیہ کہا۔ ''بیسویں صدی اور جدید مرثیہ'' ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ ان کے بارے میں جوش ملیح آبادی کی رائے ہے:

''میں اس صنف سخن یعنی مرثیے کے میدان میں ان کی روایت شکنی کی داد دیتا ہوں۔ انہوں نے لوگوں کو رلایا نہیں بلکہ جگایا ہے۔ حسین ان کے ہاں ایک مخصوص فرقے یا گروہ کے رہبر نہیں بلکہ پوری کائنات کے رہنما ہیں''۔

انہوں نے کہا تھا:

اٹھا نہیں ہے غیر شعوری مرا قلم
میدان مرثیہ میں رکھا سوچ کر قدم
ہر موڑ پر خیال یہی ہے کہ بیش و کم
رکھنا ہے حسن فکر سے تعمیر کا بھرم
شاید سخن وری کو اک آہنگ دے سکوں
ممکن ہے مرثیے کو نیا رنگ دے سکوں

شاید نہیں یقیناً انہوں نے اردو مرثیے کو نیا آہنگ اور نیا رنگ دے دیا ہے۔

ڈاکٹر ہلال نقوی کی مرتب کردہ ''مرثیے کی نایاب آوازیں'' اور ''جدید بیاض مرثیہ'' میں شامل شعرا کے مفصل تذکرے سے انحراف کرتے ہوئے کہ مذکورہ شعرا کا تعارف اور کلام ان دونوں کتابوں میں درج ہے جو قارئین کو سہولت سے میسر آسکتی ہیں۔ چند ایسے مرثیہ نگاروں کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے جو گذشتہ بیس تیس سالوں میں نمایاں ہوئے ہیں اور اس صنف کو تازہ تر رکھنے میں خون جگر صرف کر رہے ہیں لیکن بوجوہ مذکورہ کتابوں میں ان کا نام اور کلام شامل نہیں ہو سکا۔

ریحان اعظمی کے مراثی کے دو مجموعے نوائے منبر اور ریحان رتا شائع ہوئے۔ پہلے مجموعے میں چار جب کہ دوسرے مجموعے میں آٹھ مرثیے شامل ہیں۔ فرحان رضا لکھتے ہیں:

''ریحان اعظمی کے مرثیوں کی تعداد بیس سے زیادہ ہے۔ ریحان اعظمی صاحب کی قادر الکلامی کا مشاہدہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی مرثیہ ۷۲ بند سے کم نظم نہیں کیا گیا۔ انہوں نے جدیدیت کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے قدیم اجزاء کو بھی پوری طرح نبھایا ہے''۔

نوحہ، سلام، مرثیہ مجلس علم قلم
مختص ہیں یہ حروف برائے شہ امم

یہ وہ دیے ہیں جن کی تجلی نہ ہو گی کم

ہل من کے بعد آج تلک ہیں یہ محتشم

ہاتھوں سے شہ کے رنج دالم کا علم لیا

اردو کو کربلائی زباں کر کے دم لیا

احمد نوید کا سلسلۂ نسب چھٹی پشت میں جا کے میر انیس سے ملتا ہے ان کے نوحے اور منقبتیں پاکستان بھر میں مشہور ہیں۔ میر احمد نوید نے پہلا مرثیہ "وحدت الوجود" 1990 میں کہا علامہ جمیل مظہری کی پیروی میں انھوں نے بھی مرثیے کے تیسرے بند میں تیسرے مصرعے کو قافیے کی پابندی سے آزاد کر دیا۔ پہلا مرثیہ 72 بند پر مشتمل تھا اور پورا مرثیہ "میں" پر ہے۔

"میں" سے آغاز ہوئی خلوت بزم امکان

"میں" نے ظاہر کیا خود کو تو بنے ارض و سما

"میں" ہی آدم کی شر دعات ہے "میں" ہی شیطان

"میں" نہ ہوتی تو نہ ہوتا کہیں اشیا کا وجود

"میں" کا آئین ہی ہے شرح عدم شرح وجود

"البلاغ المبین" کے مصنف آغا سلطان مرزا کے نواسے ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اسلام آباد میں رہائش پذیر ہیں۔ اب تک سات مرثیے لکھ چکے ہیں جن میں ایک "صحیفۂ غم" شائع ہو چکا ہے۔ انھوں نے اپنے الگ مرثیے میں مرثیے کی تعریف و توصیف کے بعد مرثیے کا ارتقاء، قدیم مرثیہ نگاروں کا تذکرہ اور جدید مرثیہ نگاروں کے اسما کے علاوہ خواتین مرثیہ نگاروں اور اور نقادوں کا ذکر بھی کیا ہے۔

سخن کے شہر میں جب مرثیے کا نام آیا

کنول دلوں کے کھلے وجد میں کلام آیا

ادب میں لفظ یہ باعزواحترام آیا

غم حسین کا کیا خوب انتظام آیا

اس ایک لفظ کو معنی نئے ہوتے نہیں عطا

لغت میں وقف عزا نام مرثیے کا ہوا

عُرفی ہاشمی کے ایک مرثیے کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شبیہ الحسن اپنے مقالے میں لکھتے ہیں؛

" ایک عام تاثر یہ ہے کہ ہمارا شعر وادب معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں لہٰذا اس کا مطالعہ اپنے قیمتی وقت کا ضیاع ہے۔ اس طرز احساس کا اثر ہمارے جدید مرثیہ نگاروں پر بھی ہوا ہے۔"

جب منزل عمل سے ہوا دور یہ ادب
ہر زاویے سے ہو گیا مقہور یہ ادب
بھٹکے ہوئے شعور کا منشور یہ ادب
اجرت عذاب زیست ہے مزدور یہ ادب
اجڑا ہوا ہے مصر کے بازار کی طرح
تاریک ہے یزید کے کردار کی طرح

خالد عرفان کا نام اردو ادب میں مزاح کے حوالے سے شہرت کا حامل ہے لیکن ان کا پہلا مجموعہ کلام نعتیہ شاعری پر مبنی تھا۔ جو 1986ء میں "الہام" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ 1989ء میں انھوں نے "خون اور خوشبو" کے عنوان سے ایک مرثیہ لکھا جو 60 بندوں پر مشتمل ہے۔

اٹھا جو قلم حرف سے آنسو نکل آئے
گہرائی میں ڈوبے تھے لب جو نکل آئے
جیسے شبِ تاریک میں جگنو نکل آئے
ممکن ہے قلم سے مرے خوشبو نکل آئے
اس رنگ سے پھیلے مرے مضمون کی خوشبو
جیسے کہ مہکتی ہو کہیں خون کی خوشبو

جدید مرثیے پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر بلال نقوی کہتے ہیں:

"اردو مرثیہ جس نے ذکر کی منزل سے اپنا سفر شروع کیا تھا وہ فکر کی منزل میں ایک ایسے منصب پر فائز ہو گیا جسے دوسری اصناف سخن کے درمیان با آسانی پہنچایا جا سکے گا، جدید مرثیہ نگار عصر حاضر کی معاشرتی، معاشی، اقتصادی عمرانی اور سیاسی معاملات سمجھ کر مرثیہ لکھا ہے۔ آج مرثیے پر Stagnation کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ آج کے مرثیے میں زندگی کا وہ تمام شعور نظر آتا ہے جس سے ہم گزر رہے ہیں۔"

اس رائے کی روشنی میں درج ذیل بند دیکھیے اور اس بات کا اندازہ لگایے کہ واقعی جدید مرثیہ کیسے کیسے مسائل کو موضوع بنا رہا ہے۔

خمار فاروقی

عرفان و آگہی کی پذیرائی ہے حسین
بیمار زندگی کی مسیحائی ہے حسین
ظالم کے حق میں تیغ شکیبائی ہے حسین
اللہ کے جلال کی رعنائی ہے حسین
مالا کسی کو ظلم کا جینے نہیں دیا
باطل کو اس نے پھر سے پنپنے نہیں دیا

یداللہ حیدر

اللہ اللہ کیا عدالت کے لیے تھا اہتمام
حکم تھا داخل سزا میں ہو نہ جوش انتقام
اتنی ضربت چاہیے اتنا ہی بس زور عام
عدل کا رہ جائے جس سے تا ابد دنیا میں نام
کتنی روشن یہ شہادت ہے کمائی ذات پر
بس میں ہو قاتل مگر قابو ہے جذبات پر

قیصر نجمی

مجبور کا لہو ہو کہ مظلوم کا لہو
مزدور کا ہلو ہو کہ محکوم کا لہو
مہجور کا لہو ہو کہ محروم کا لہو
نوخیز کا لہو ہو کہ معصوم کا لہو
ہر بے خطا لہو میں حمک کربلا کی ہے
ہر غم زدہ لہو میں کسک کربلائی ہے
جعفر عسکری جعفر

انسان اپنے ہاتھوں سے خود پائمال ہے

ناواقفِ خدا کا یہ فکری زوال ہے

معقولیت کہاں یہ فقط احتمال ہے

اس راستے سے حق کا گزرنا محال ہے

اشباتیت نے سچ کو فسانہ بنادیا

انساں کو تیر زر کا نشانہ بنادیا

اختر عثمان کے تین مرثیوں پر مشتمل مجموئے "اشک آباد" پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر شبیہ الحسن رضوی لکھتے ہیں:

"اختر عثمان مضمون آفرینی میں اپنی تمام تر جدیدیت کے باوجود اپنے مزاج واسلوب میں کلاسیکی ہے۔"

اختر عثمان کا پہلا مرثیہ 1988 میں مکمل ہوا تھا اس وقت ان کی عمر بیس سال کے قریب تھی۔ اب تک انھوں نے اٹھارہ مرثیے کہے ہیں۔"اشک آباد" میں شامل تینوں مرثیوں سے ان کی قدرت کلام، ندرت فکر اور کلاسیکی روایت سے گہری جڑت ظاہر ہوتی ہے۔ تلوار کی تعریف میں ان کے قلم کی تیزی اور نمایاں ہو جاتی ہے۔

یزداں نمر اج عرش سے اتری ڈھلی ہوئی

دست نبی سے زینتِ دست علی ہوئی

ایک ایک معرکے میں برابر چلی ہوئی

مولا علی کے ہاتھ کی تھی وہ پلی ہوئی

تھی خانہ زادِ ازل سے شہ مشرقین کی

بچپن سے جانتی تھی طبیعت حسین کی

"رثائے عصر" عادل مختار کا مجموعہ ہے جس میں چھ مرثیے شامل ہے۔ مجموعے کے بعد انہوں نے ایک مرثیہ "عقل سرخ" ابھی مکمل کیا ہے۔ مرثیوں کے عنوان ہی سے ان کی جدت طبع مترشح ہوئی ہے۔ کتاب میں "خامہ بدوش" کے عنوان سے شامل مرثیہ بھی ان کے اسی مزاج کا عکاس ہے۔ جاید مختصر مرثیے کو عادل مختار کی صورت میں نہ صرف ایک اچھا تخلیق کار میسر آیا ہے بلکہ ان کے ہاں تنقیدی صلاحیت کا بھی وفور پایا جاتا ہے۔ انھوں نے مرثیے کی صنف کے تعارف و تفہیم میں بھی لائق اعتنا کاوشیں کی ہیں۔

سر جدالاش رقم کر کے قلم ہے خاموش

جلد نمبر06، شمارہ نمبر01، جون-2025

داستاں ختم ہوئی اور ہے عالم میں خروش
بر سرِ نیزہ نمایاں ہے سر خامہ بدوش
سر جدا تن سے جدا حال ہے فردا سے نزدوش
اس کہانی ہی کے اب گرد زماں رہتا ہے
رگ ہر دور میں خون اس سے رواں رہتا ہے

راحل بخاری کا تعلق لکی مروت سے ہے۔ رثائی شاعری میں ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا انحصار بہت سلیقے سے ہوا ہے۔ ان کا مجموعہ "فواطم" جس میں آل اطہار کی مخدرات کے حوالے سے کلام درج ہے وہ جناب رسول پاک کی والدہ معظمہ حضرت بی بی آمنہ کو یوں خراج پیش کرتے ہیں۔

نازِ خدا کے ناز اٹھاتی ہے آمنہ
زلفوں کے پیچ و غم کو سجاتی ہے آمنہ
لوری میں حمدِ پاک سناتی ہے آمنہ
انگلی پکڑ کے ساتھ چلاتی سے آمنہ
رفعت کا یہ علاقہ ہے شایان آمنہ
کل عالمیں کی جان ہوئی جان آمنہ

ان کے مذہبی کلام پر مشتمل دوسرے مجموعے کا نام "الملام" ہے۔

راحل بخاری جدید اردو مرثیے کے لیے روشن مستقبل کی علامت ہے۔

بھکر کے موسیٰ کلیم بخاری بھی اردو مرثیے کی آبیاری کرنے والوں میں شامل تھے لیکن انھیں وقت نے مہلت نہیں دی ورنہ وہ اس صنف میں ضرور یادگار نقوش چھوڑتے۔

سرمایہ حیاتِ پیمبر کہوں جسے
عزم و ثبات و صبر کا پیکر کہوں جسے
ہمت کے آسماں کا نیئر کہوں جسے
صحرائے کربلا کا دلاور کہوں جسے

جلد نمبر06، شمارہ نمبر01، جون-2025

دنیا میں لا الہ کا بانی وہی تو ہے
عالم تمام خاک ہے پانی وہی تو ہے

اس وقت بھکر میں صفدر کربلائی اردو اور سرائیکی رثائی شاعری میں اپنا حلقہ اثر وسیع کرتا جارہا ہے۔ سامعین کی ایک بڑی تعداد اس کی مجالس میں دور دور سے شرکت کرتی ہے۔ اسی طرح شوکت رضا شوکت قطعات و منظومات کے علاوہ مسدس میں بھی شہرت رکھتے ہیں۔ یہ دونوں نام محسن تقوی کی قبیل کے شعرا سے تعلق رکھتے ہیں جن کا کلام مجالس میں شوق سے سنا جاتا ہے اور بعد میں کتابی صورت میں سامنے آتا ہے۔ "موج ادراک" اور "فرات فکر" محسن نقوی کے وہ مجموعے ہیں جن میں مسدس کی شکل میں ان کی مقبول نظمیں شامل اشاعت ہیں۔ صنف مرثیہ کے فروغ میں کچھ ادبی رسائل نے خاص طور پر اپنا کردار وقف کر رکھا ہے۔ ڈاکٹر بلال نقوی کا "رثائی ادب" یا اصغر مہدی اشعر کا "فروغ مرثیہ" اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ "فروغ مرثیہ" میں غیر مطبوعہ مراثی شائع کیے جاتے ہیں۔ دور حاضر کے ایک نئے مرثیہ گو قیصر عباس قیصر کا ایک مرثیہ:

در حال شہنشاہ وفا مرے سامنے ہے

عباس آرزوئے دل بوتراب ہے
عباس چشم فاطمہ زہرا کا خواب ہے
عباس عاشقی میں وفا کا نصاب ہے
عباس اہل بیت نبی کا حجاب ہے
بازو قلم کیئے گئے جن کے فرات پر
سایہ اسی کے ہاتھ ہے کا سر کائنات پر

ابرار حسین باری کا ایک مرشد "سرشک" شائع ہوا تھا کہ تقدیر نے اسے دوسرے مجموعے کی اشاعت کا موقع نہ دیا۔ اس وقت دور حاضر کے نظم و غزل کے کئی مشہور شعرا مرثیے میں بھی طبع آزمائی کرتے رہتے ہیں، عباس تابش قمر رضا شہزاد، شکیل جاذب، رحمان فارس، محمد علی ظاہر کی تخلیقات فیس بک پر پڑھنے کے ساتھ ساتھ محافل میں سننے کا موقع بھی ملتا رہتا ہے۔

آخر میں عشرت آفریں کے مرثیے سے ایک بند پیش کر کے یہ مضمون یہاں نامکمل چھوڑا جاتا ہے کہ کتنے ہی نام مری کوتاہ علمی کے باعث تحریر ہونے سے رہ گئے ہوں گے جب کہ صفحات اور وقت مزید طوالت کی اجازت نہیں دے رہے۔

حق پرستوں سے وہ دنیا کے طلب گاروں کی جنگ

جلد نمبر06، شمارہ نمبر01، جون-2025

روشنی سے وہ اندھیروں کے پرستاروں کی جنگ
یہ نہ تھی تیر و کماں کی اور تلواروں کی جنگ
کربلا کی جنگ تھی دراصل کرداروں کی جنگ
جد یزید اس درجہ خائف تھا شہ ابرار سے
معرکہ درپیش تھا کردار کو کردار سے

☆☆☆☆